بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

علماء امت اور زعماء دین کی خدمت میں

مدیر تکبیر محمد صلاح الدین کی شہادت

یکم دسمبر ۱۹۹۴ء بمطابق ۲۶ جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ ساڑھے ۱۲ بجے دن کے جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے دفتر اہتمام میں حاضری ہوئی تو چینی زعماء کا ایک وفد جناب عبدالستار (عبدالکریم رجدہ) کی قیادت میں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے دارالعلوم تشریف لایا تھا وفد کے شرکاء جناب ذالنون محمد قاسم ترکستانی (طائف) جناب نور احمد ترکستانی (ریاض) جناب عبدالقادر دعوہ (مکۃ المکرمہ) اور جناب علی خان صاحب اور ان کے دیگر رفقاء تھے۔ وفد کے ساتھ دارالعلوم کے مہتمم حضرۃ مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ مصروف گفتگو تھے، اچانک آنے والے اس وفد کیلئے دفتر اہتمام ہی میں ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا حضرۃ مہتمم صاحب کے اصرار پر احقر بھی باہمی گفتگو، تبادلہ خیالات اور علمی و دینی مذاکرات اور مشاورت میں شریک ہوا، یہ چینی زعماء چین میں کافرانہ نظام کے جبر و استبداد کے دور میں سعودی عرب ہجرت کر گئے تھے اور اب جو وہاں سے مسلمانوں کو قلیل تعداد میں حج پر جانے کی آزادی ملی۔ روسی نظام کے انہدام کے بعد وہاں کے ظالمانہ نظام کا پنجۂ گرفت قدرے کمزور ہوا تو مسلمانوں نے پھر سے دینی تعلیمات کے حصول و ترویج کا کام شروع کر دیا انہوں نے بتایا کہ تعلیماتِ اسلام کے حصول کی غرض سے دسیوں چینی طلبہ اپنے طور پر ہجرت کر کے اسلامی ممالک کا رخ کر رہے ہیں ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ وسطی ایشیاء کی نو آزاد ریاستوں سے آنے والے طلبہ کے لیے تعلیم کے اہتمام کی طرح چینی طلبہ کے لیے بھی ان ہی کی زبان میں تعلیم و تدریس اور ان کے قیام کا انتظام کرے حضرۃ مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے امکان بھر اپنے تعاون اور چینی طلبہ کے لیے ان ہی کی زبان میں تعلیم کے سلسلہ میں اپنے ممکنہ تعاون کا اظہار فرمایا، چنانچہ چینی طلبہ کا پہلا گروپ دارالعلوم پہنچ چکا ہے اور ان کے لیے ان ہی کی زبان میں علیحدہ تعلیم کا اہتمام کر دیا گیا ہے۔ اس موقع پر چینی زعماء نے یہ بھی بتایا کہ چین کے ترکستانی علاقہ میں اب بھی علماء طلبہ اور دینداروں پر مظالم اور جبر و استبداد کا وہی پرانا وطیرہ روا رکھا گیا ہے۔ پھر عالمی حالات زیر بحث آئے، سب حضرات کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ روسی نظام کے انہدام کے بعد اب امریکی جارحیت کا سب سے بڑا مدِ مقابل اور سخت جان حریف اسلامی تعلیمات دینی قوتیں اور سچے مسلمان ہیں اور دینی قوتوں کی حالیہ آویزشیں، انتشار و اختلافات اور باہمی ناچاکیاں بھی صہیونی سازشوں کا نتیجہ ہیں، اس سلسلہ میں دینی قیادت، علماء اساتذۂ علم مشائخ اور دینی تحریکوں کے زعماء کا کردار بھی زیر بحث آیا۔

یہ علمی و دینی اور روحانی محفل ختم ہوئی، اضیاق رخصت ہوئے مگر اس کے اثرات احقر کے قلب و ذہن پر پتھر کی لکیر بن گئے ذہنی اور فکری طور پر کئی تجزیے، جائزے، ارادے، عزائم اور خاکے بنتے رہے اور کئی سانچوں میں ڈھلتے رہے سب کا ہدف اور نتیجہ وہی نکلا جو ذیل کی سطور میں علماء امت اور زعماء دین کے حضور پیش خدمت ہے۔ اگر لہجہ ترش، انداز تلخ اور سوءِ ادب کو کوئی ادنیٰ سی خلش بھی محسوس ہو تو پیشگی عفو کی درخواست ہے۔

آپ حضرات سے بڑھ کر اس حقیقت سے کون واقف ہوگا کہ دین (اسلام) چند فقہی مسائل کچھ روحانی واردات اور خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، فرد کی ذات سے لے کر انسانی کائنات تک کا ہر گوشہ دین کے احاطۂ کار میں شامل ہے، باطنی واردات اور ظاہری معاملات دین ہی کے دائرے میں محوِ گردش ہیں، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر پر قدرتِ حق نے اجتماعی قیادت اور عالمی امامت کا تاج سجایا اور قیامت تک باقی رہنے والی نسلِ انسانی کے ہمہ نوعی مسائل کا حل دینِ اسلام میں منحصر اور مضمر ہے اور یہ حل چند اصولی ضابطوں اور تجریدی اشارات کے ذریعے واضح نہیں کیا گیا۔ بلکہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے اسلامی ریاست تشکیل دی اور خلافت کا باضابطہ ایک ادارہ وجود میں آیا جس نے (محدود مدت ہی سہی) اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نظام اور مثالی معاشرت کو محسوس اور مشہود حقیقت کے طور پر اکنافِ عالم میں متعارف کرایا۔ اس دور کا ہر وہ کونہ اور گوشہ جو ذرا بھی تہذیب آشنا تھا اس نظام کی برکتوں سے فیض یاب ہوا اور رہتی دنیا تک یہی چند سال قوموں کے آدرشوں اور آشاؤں کا مرکز و محور بن کر رہ گئے ہیں اور آج کا امریکی یورپی، افریقی اور ایشیائی انسان اسی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش میں مصروفِ سفر ہے۔

یہ امر بھی چنداں محتاجِ وضاحت نہیں کہ عالمِ کفر ہر محاذ پر عالمِ اسلام سے برسرِ پیکار ہے وہ کفر خواہ مشرق کا ہو یا مغرب کا! یعنی اشتراکی ہو یا سرمایہ دارانہ، اگرچہ نظر بظاہر یہ دونوں نظام (اشتراکی اور جمہوری) چند اوپری سطحوں پر ایک دوسرے سے الجھتے دکھائی دیتے ہیں لیکن تاریخ کا ہر ورق اسلام کے مقابلہ میں ان دونوں کے ذہنی اور فکری اتحاد کی برسرِ عام چغلی کھاتا اور گواہی دیتا ہے، چاہے مرحلہ سقوطِ خلافت کا ہو یا مسلم ممالک کو غلام بنانے کا، معاملہ تعمیرِ افغانستان کا ہو یا مسئلہ فلسطین کا اور اسی طرح آذربائیجان کے مسلمانوں میں اسلامی انقلابی لہر ہو یا وادیٔ کشمیر کی تحریکِ حریت و خود مختاری ہو، ہر موڑ پر عالمِ کفر کے مختلف اعضاء باہمدگر جڑے نظر آتے ہیں۔ اور تاریخ کے ان اوراق کو بار بار پلٹنا بھی گویا تحصیلِ حاصل ہے کہ عالمی استعمار کے خلاف مختلف ممالک کی جدوجہدِ آزادی کی پشت پر کارفرما جذبہ

دینی اور مذہبی تھا اور آزادی کے حق میں پہلی آواز بھی مکاتب و مدارس سے بلند ہوئی، الجزائر، سوڈان لیبیا، انڈونیشیا اور پاکستان کے استقلال و قیام میں مؤثر ترین عنصر دین کا تھا مگر بدقسمتی سے عین آخری مرحلے میں زمامِ کار سیکولر ہاتھوں میں چلی گئی اور مذہبی رہنما ان تحریکوں کا ضمیمہ بن کر رہ گئے۔

اس مسئلے سے بھی آپ حضرات سب سے زیادہ واقف ہیں کہ مسلم ممالک کا معاشرہ تمام تر اکھاڑ پچھاڑ مغرب کی یلغار اور ثقافتی و نفسیاتی بوچھاڑ کے باوجود اب تک مذہبی معاشرہ ہے اور علماءِ دین اس کا جزوِ اعظم ہیں، معاملہ تبلیغ اسلام کا ہو یا تعمیرِ اخلاق کا، بات دینی تعلیم کی ہو یا فکری رہنمائی کی، ضرورت تقویٰ و طہارت کی ہو یا رُشد و ہدایت کی، مسئلہ فرد کی کردار سازی کا ہو یا اجتماع کی چارہ سازی کا نگاہِ بے اختیار علماء کرام کی طرف اٹھتی ہیں کیونکہ افرادِ معاشرہ انہیں علومِ نبوت کا وارث اور منصب قیادت و سیادت کا حامل سمجھتے ہیں۔ اس اعتبار سے مسلم عوام اور علماءِ کرام کا باہمی ربط مچھلی اور پانی یا پھول اور خوشبو جیسا ہے مگر اس فطری ربط کے باوجود معاشرتی اور ذہنی ربط و ارتباط کمزور پڑتا جا رہا ہے ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے اس کے کچھ اسباب ہوں گے اور ہیں، ہرچند کہ یہ اسباب خوشگوار نہیں لیکن ان کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ ضروری ہے اگرچہ ایسا کہتے ہوئے زبان لغزیدہ اور لکھتے ہوئے قلم لرزیدہ اور ان اسباب کو بیان کرتے ہوئے سچی بات یہ ہے کہ دل کبیدہ ہو جاتا ہے اور اس کے پیچھے احترام اور عقیدت کی وہ کیفیت ہے جو وارثانِ مسندِ نبوت علمائے کرام سے ہے کہ دین جہاں، جتنا اور جیسا کچھ ہے علماء کے وجودِ مسعود کے باعث ہے۔ ورنہ مسلم معاشرہ کب کا تاریخ کے طاقچوں میں نذرِ نسیاں ہو چکا ہوتا

حضرات علماء کرام! اس ضمن میں تاریخ کے ہر موڑ اور واقعات کے ہر مرحلے کی نقاب کشائی کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی طویل سیاسی و عمرانی تجزیہ پیشِ نظر ہے بلکہ صرف اُن مختصر اسباب کو دل کی گہرائیوں سے اُمڈتے ہوئے ادب اور نہاں خانۂ ذہن و ضمیر میں موجود عقیدت کے ساتھ پیش کیے جائیں گے جو تعداد میں محض تین[۲] ہیں مگر تأثر کے اعتبار سے اہم ترین ہیں۔

اوّلاً: اس وقت دنیا کا عمومی معاشرہ تین[۳] شیطانی گروہوں کے نرغے میں ہے۔ ایک طرف سائنٹیفک سوشلزم کے علمبردار ہیں (جو اگرچہ اپنے اندرونی فکری تضادات اور عملی ناکامیوں کے باعث پسپائی اختیار کر چکے ہیں)

دوسری جانب مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے حامی جو انسانیت کو اپنے شکنجۂ استحصال میں کس کر اس کا آخری قطرۂ خون نچوڑنے پر کمربستہ ہیں اور تیسری طرف وہ اباحیت پسند اور مادیت پرست ہیں

ہ معاشرے کو محض لذت کدہ اور عیش گاہ بنانا چاہتے ہیں۔ متذکرہ صدر تین گروہوں کے علاوہ مسلم ممالک کے حکمران طبقات بھی قریب قریب روحِ اسلام سے ناآشنا نفاذِ اسلام سے برگشتہ اور فروغِ اسلام سے یکسر بے تعلق ہیں، اِس وقت غلبۂ اسلام، استحکامِ عالمِ اسلام اور اعلائے کلمۂ حق کے لیے مینارۂ نور ہے و علماء کرام ہیں جن کی متفق قیادت شیطانی گروہوں کے حصار کو توڑ سکتی ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ دینی قوتوں کے انتشار نے ہماری ملت کی قوت کو اتنا مضمحل کر دیا ہے کہ عامۃ الناس اب لادین سیاسی قیادت پر قناعت رنے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں جو کسی المیے سے کم نہیں حالانکہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ نے دنیا کو ایک اُمت ملت سے روشناس کرایا تھا جسے "اُمۃ وسطیٰ" اور "ملتِ حنیف" کا عالمگیر اعزاز اور خطاب نصیب وا اب وہ ملت پارہ پارہ اور اُمت ٹکڑے ٹکڑے ہوتی جا رہی ہے، جس اُمت یا ملت نے ایک مانے میں دنیا کو ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک کلمہ اور ایک امام سے رُوشناس کرایا تھا۔ اب ہ خود "بے امام" بن کر رہ گئی ہے، ہم جانتے بھی ہیں اور مانتے بھی کہ امتِ مسلمہ کے مختلف طبقات ے درمیان کچھ کلامی اختلافات ہیں، چند تاریخی تنازعات ہیں، بعض فقہی تضادات ہیں لیکن اس سب کے باوجود عظمتِ اسلام اور غلبۂ اسلام کا تصوّر اور جذبہ ان سب پر حاوی اور بھاری ہے اور اسی جذبے کو "مرشدِ راہ" بنا کر بڑی سے بڑی کلامی، تاریخی اور فقہی خلیج عبور کی جا سکتی ہے۔

مسلّمات اور فروعات میں حدِ امتیاز قائم کر کے اسلامی انقلاب کی منزل کی طرف محوِ سفر ہوا جا سکتا ہے۔ غالباً ایسی ہی نوعیت کی کچھ باتیں تھیں جو بڑھ کر اتنی سنگین ہو گئیں کہ دو مواقع پر عالمِ اسلام نیادوں سمیت لرز کر رہ گیا۔ ایک سانحہ سقوطِ بغداد کا اور دوسرا المیہ تحلیل خلافت کا جنکے زخم آج بھی رِس رہے ہیں

ثانیاً : عصرِ رواں کے پچاس ساٹھ سالوں میں ایک تبدیلی اور بھی آئی ہے اور جو قطعاً خوشگوار نہیں اور جس کے اثرات رفتہ رفتہ اب ہر سطح پر محسوس کیے جا رہے ہیں، وہ یہ کہ حضرات علماء کرام نے مختلف ممالک میں مغربی استعمار کے دیئے ہوئے سیاسی فریم ورک میں اپنے آپ کو فٹ کر کے جمہوری (معروف عنوں میں) اور انتخابی سیاست کے ذریعے غلبہ اور نفاذِ اسلام کی کوشش کی جس سے اسلام تو کیا نافذ ہوا ؤد وجودِ اسلام موضوعِ بحث بن گیا اور علمائے کرام اُن باٹوں تُلنے لگے جو انگریز نے اپنے مقاصد کے لیے ڈھالے تھے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ علماء کرام سیاست میں حصہ نہ لیں سیاست اسلام کا جزو ہے۔ تہذیب مدن اور تدبیرِ منزل سیاست کہلاتی ہے اور یہ تبا علماء کرام کے وجود پر راست آتی ہے، مگر اصرار یہ ہے کہ مغربی جمہوری سیاست ہرگز اس لائق نہیں کہ اس بازار سے گزرا جائے کجا کہ اس میں بھی دکانوں کا

الحق

ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق) ملاحظہ فرمایا اب تیسرا سبب پیشِ خدمت ہے۔

جہاں تک معلوم ہو سکا اور مطالعہ اور حافظہ ساتھ دیتا ہے ہر ملّی اور سیاسی تحریک کا نقطۂ آغاز آپ کی ذاتِ گرامی بنی ہے۔ بارش کا پہلا قطرہ بننے کا اعزاز آپ کو حاصل رہا ہے مگر جب چھما چھم برسنے کا موقع اور سرزمینِ ملّت میں روئیدگی کا وقت آیا تو بوجوہ کچھ اور لوگ گہرے بادل بن کر اُٹھے اور مطلعِ ملّت و سیاست پر چھا گئے جس کے نتیجے میں سارا کریڈٹ انہیں مل گیا۔ ماضی قریب کی تاریخ کو سامنے رکھ لیں تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ سنوسی تحریک، امام شاملؒ کا نعرۂ حق ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، لوزی موومنٹ، تحریکِ خلافت، تحریکِ ہجرت، بالاکوٹ کا مقتل جزائر انڈیمان کی داستانِ عزیمت و شہادت، قیام پاکستان، تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ اور جہادِ افغانستان ہر جگہ مؤثر ترین عنصر دین و مذہب کا رہا ہے، ہر تعذیب و تعزیر ہنسی خوشی برداشت کی گئی کہ جذبۂ محرکہ دین تھا، الجزائر میں قبرستان آباد ہو گئے، سوڈان و لیبیا کے صحرا لالہ زار ہو گئے، مصر و شام کے گلی کوچے داستانِ شوق و عشق کے ورق بن گئے، سرزمینِ ہند بساطِ عزم و ہمت قرار پائی، افغانستان خونِ شہادت سے لالہ زار بن گیا، محض اس لیے کہ دل و دماغ کی پیشانیاں سجدہ گاہِ دین پر جھک گئیں، الغرض ہر تحریک کا مواد اور محرک دین تھا اور اسے رجالِ دین کی قیادت حاصل تھی مگر جب پھل پکنے کا وقت آیا تو جھولیاں انہوں نے پھیلا دیں جو یا تو نکتہ چین تھے یا تماش بین! اور پھر یہی لوگ ہیرو بن گئے، اور پھر رفتہ رفتہ علماء کرام کو اس دھارے سے الگ کرنے کا معمول سا بن گیا، اور غالباً علماء بھی اس پر قانع اور راضی ہو گئے خواہ طوعاً یا کرہاً حالانکہ امرِ واقعہ ہے کہ علماء کرام نے نہ کبھی "سر" کا خطاب حاصل کیا نہ "آنریبل" کہلائے نہ "خان بہادر" کا لقب ملا، اور نہ ہی "نہ ہزاری" اور "دہ ہزاری" کے منصب پر فائز ہوئے، اور اسی طرح آج تک علماء نے نہ ملک توڑا نہ ملک بیچا، نہ مارشل لاء لگایا اور نہ ملک و ملّت کے مفاد کو غیروں کے ہاتھ میں رہن رکھا، ان "اعزازات" کی مالا ان کے گلے میں نظر آتی ہے جو شومئی قسمت آج منصبِ قیادت پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود علماء سیکولر قیادت کا ضمیمہ بننے پر رضامند ہو گئے، کتنے اونچے نام ہیں جو سیاسی بونوں کے حوالے کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔

مدّعا یہ ہے کہ آپ حضرات ہر معاملہ میں قیادت کی زمام اپنے ہاتھ میں رکھیں، ضمنی کے بجائے مائدانہ کردار ادا کریں کوئی حکمران، کوئی جاگیردار، کوئی سرمایہ دار اور کوئی سیاستدان آپ کو اپنی مرضی کے ایشو پر نہ اُبھار سکے، البتہ بعض ممالک میں علماء نے کسی حد تک اس داغ کو دھو دیا ہے انہوں نے روزِ اوّل سے زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لی اور اب تک انقلاب کو کسی کی تحویل میں نہیں جانے دیا ایسے انقلاب

سے ہزار اختلاف ہو سکتا ہے مگر علماء کی قیادت ایک ایسا پہلو ہے جس پر آپ ضرور توجہ فرمائیں۔

علماء ذی وقار! آج کل یورپ جو دھنڈورہ پیٹ رہا ہے کہ مسلم ممالک میں "بنیاد پرستی" کی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں اسلام "جنگجو" ہوتا جا رہا ہے یہ صرف اس لیے ہے کہ اُسے "مُرغانِ دست آموز" کی قیادت مطلوب ہے وہ مجاہد اور متقی علماء کو اگلی صفوں میں نہیں دیکھنا چاہتا یورپ کو اسلام سے بھی زیادہ "اسلامی قیادت" سے بُغض ہے وہ کسی آکسن اور کینیڈ ٹائپ سیاستدان کے اسلام سے خوفزدہ نہیں اُسے اُس اسلام سے ڈر ہے جسے پیش کرنے کے لیے روحِ اسلام سے ہم آہنگ علماء سرِ فہرست ہوں، کیوں کہ خدا ترس اور رمز شناسِ دین علماء کے ہاتھوں برپا ہونے والا انقلاب "اسلامی" ہوگا جو نئے نظام کی تلاش میں سرگرداں دُنیا کو حقیقی اور خود مختار قیادت فراہم کرے گا۔

مدیر تکبیر محمد صلاح الدین کی شہادت

دسمبر کے آغاز میں ملک کے معروف ہفت روزہ تکبیر کراچی کے مدیر شہیر بھی بالآخر اسی دہشت گردی اور لاقانونیت کا شکار ہو گئے۔ جس کے خاتمہ کے لیے مرحوم ابتدا روز سے پوری جرأت، قوت ایمانی بہادری اور جذبۂ جہاد کے ساتھ جہاد بالقلم اور جہاد باللسان میں مصروف تھے۔ مرحوم حق گوئی و بے باکی کا ایک نمونہ، اسلامی صحافت کے احیاء و ترویج کی ایک مثال، عالمی سیاست پر اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیق و تجزیہ اور آزادیٔ صحافت کا ایک لازوال کردار تھے۔ ان کا دماغ مسلمانوں کی بہتری اور فلاح کی سوچتا تھا، دل لوگوں کے دکھ درد پر تڑپتا تھا، دانش امت کے بہترین مستقبل کا سوچتی تھی۔ اور اپنی دانست کے مطابق جسے حق اور صواب سمجھتے برملا کہہ دیتے تھے۔ اپنے مشن میں مخلص تھے اسی اخلاص نے ان کے پرچہ کو قلیل ترین مدت میں ملک کے جرائد میں ایک ممتاز ترین مقام دلا دیا تھا، مرحوم کو جہاد افغانستان کے حوالے سے جنرل محمد ضیاء الحق اور شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ سے بے حد محبت تھی۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کے سانحۂ ارتحال پر اپنی ادارتی تحریر میں انہوں نے لکھا تھا کہ۔

> "صدر ضیاء الحق کی جہادِ افغانستان کی سرپرستی تو معروف اور متعارف تھی لیکن جہادِ افغانستان کی انگیخت میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کی ذات گرامی نے پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر دارالعلوم حقانیہ کی تاسیس کر کے جو شمع ہدایت روشن کی تھی اس کی تنویر